مولانا سید محمد رابع ندوی

خلیج کی جنگ اور مختلف کردار

(بے لاگ تجزیہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ)

عراق تباہ ہو رہا ہے، کویت تباہ ہو چکا۔ ملت اسلامیہ کا یہ خطہ جس کو خلیج عربی اور خلیج فارسی کہتے ہیں۔ لہولہان اد
عوں سے چُور ہو رہا ہے۔ اور یہ سب قصہ ایک آن پر اور محض ناک اونچی رکھنے کے لئے ۲ راگست کو عراق نے کویت
بضہ کرلیا۔ اور وہاں کی سب دولت لوٹ لی۔ اس نے اس اقدام سے قبل کویت پر اور اس کے پڑوسی عرب ملکوں
یہ الزام لگایا کہ ان کی غلط پالیسی سے عراق کو اقتصادی پریشانیوں اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ تیل سستا
ۓ رہے ہیں اس کی وجہ سے تیل کا مارکیٹ مندا ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عراق کا تیل بھی سستا فروخت ہو رہا
ے اور کویت اپنے شمالی علاقہ سے جو عراقی سرحد سے متصل ہے تیل اس طرح نکال رہا ہے کہ اندر اندر عراق کا تیل بھی
ع کھنچ کر کویت کے تیل کے کنوئیں میں چلا جاتا ہے لہذا ہمارے تیل کی ایک مقدار کویت میں چلی گئی ہے۔ ہم نے آٹھ سال
ن سے جنگ لڑی ہے، نہ لڑتے تو ایران فتح کرتا ہوا ان خلیجی ملکوں کو بھی فتح کرلیتا۔ لہذا یہ ملک ہمارا گھاٹا پورا کریں اور
رے ملک میں جنگ سے جو تباہی آئی ہے اس کو ٹھیک کرنے کے لئے ہم کو مدد دیں۔ اور تیل کی پالیسی میں ہماری بات
ں۔ خلیج کے ان ملکوں نے جن میں سعودی عرب اور کویت پیش پیش تھے کہا کہ جنگ میں ہم نے پچاس ارب ڈالر
ں کھرب روپے) کی مدد پہلے ہی دی ہے کچھ اور لے لو لیکن ہم سارا مطالبہ پورا کرنے کے حال میں نہیں۔ جھگڑا بڑھا تو عرب
۔ اور مؤتمر اسلامی نے صلح صفائی کی کوشش کی لیکن صدر عراق صدام حسین نے کہا کہ قطع الاعناق لا قطع الارزاق
ی گردنیں کٹوائیں گے لیکن پیٹ کی ضرورت نہ کٹوائیں گے) اور اسی کے ساتھ اپنی فوج کویت کی سرحد پر لگا دی۔
یت نے دوستوں کو متوجہ کیا۔ سعودی عرب اور مصر نے سمجھایا۔ صدام حسین نے کہا کہ ہم لڑ نہیں رہے ہیں، یوں ہی اثر ڈال
ہے ہیں۔ ہوتے ہوتے بالآخر یکم اور ۲ راگست کی رات کو فوج کویت کے اندر داخل کر دی۔ اور قبضہ کر کے فوج کویت
بنو یا سرحد تک پہنچا کر سعودی عرب کی سرحد پر لگا دی اور کہا کہ ہم سعودی عرب کو بھی سمجھ لیں گے اور یہ نعرہ دے
ہ اب تو فلسطین کو فتح کرنا ہے۔

لیکن پہلے ان عرب ملکوں کو سمجھ لیں اور کہا کہ آؤ مسلمانو! جہاد کرو فلسطین کو آزاد کرانا ہے۔ عرب ملکوں نے کہا کہ

فلسطین کا راستہ ادھر سے کب ہے۔ اور فلسطین پر آج تک تو کوئی گرمی نہیں دکھائی۔ کویت پر قبضہ کرتے وقت اسلام کا جذبہ زور کرنے لگا۔ ان سب کا جواب صدر صدام حسین نے یہ دیا کہ بس کچھ نہیں، اب تو جہاد ہوگا فلسطین لیں گے اور جو ہمارے راستہ میں رکاوٹ ڈالے گا اس کو بھی ہم سمجھ لیں گے۔

کویت کے تعلقات برطانیہ سے تھے، اور سعودی عرب کے تعلقات امریکہ سے۔ عراق کی تیاری اور ٹریننگ روس نے کرائی تھی۔ لہٰذا یورپ اور امریکہ کی طاقتیں اپنے حریف روس کے خطرہ کو سامنے رکھتے ہوئے کویت اور سعودی عرب کو بچانے کے لئے لاؤ لشکر کے ساتھ پہنچنا شروع ہوگئیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ عراق فوراً کویت چھوڑ کر واپس چلا جائے ورنہ ہم طاقت کے زور سے اس کو کویت سے نکالیں گے۔ اس مناظرہ میں پانچ ماہ لگ گئے۔ اور بتدریج امریکہ اور یورپ خطرناک فوجی تیاریوں کے ساتھ سعودی عرب کے شمال مشرقی علاقے میں جماؤ کرتے چلے گئے۔

دنیا کے ہر ملک نے عراق کو سمجھایا کہ کویت چھوڑ دے۔ تاکہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ جنگ بڑی تباہ کن ہوگی اور نقصان اِدھر کا ہو یا اُدھر کا، صرف مسلمانوں کا ہوگا۔ اسرائیل دور ہے اس کا نمبر مسلمانوں کے بعد آئے گا۔ لیکن صدام حسین نے نہ مانا۔ ان کے سامنے تو یہ تھا کہ گردنیں کاٹنا منظور، پیٹ کٹنا منظور نہیں (قطع الاعناق لا قطع الارزاق) اور ہماری طاقت ایسی ہے کہ ہم تو فلسطین کو بھی آزاد کرائیں گے اور امریکہ کی فوجوں کو خون میں نہلا دیں گے اور امریکہ کو پتہ چلے گا جب اس کے فوجیوں کے تابوت امریکہ پہنچیں گے۔

دنیا کا مسلمان جو جرأت کے ساتھ بولنے پر خوش ہوتا ہے اور دشمن کو للکارنے پر خوشی میں بے قرار ہو جاتا ہے، اور نعرہ لگانے والے کے نہ حالات دیکھتا ہے اور نہ اس کے مخفی مقاصد کو بلکہ ایسے لیڈر کو آنکھ بند کر کے اپنا ہیرو بنا لیتا ہے۔ صدر صدام حسین کا فوراً عاشق اور فدائی بن گیا اور اس طرح صدر صدام حسین نے اپنی ملک گیری اور حصولِ مال کے کام کو جہاد اور فلسطین کے نام سے خلط ملط کر کے اپنے کو مسلمانوں کا ہیرو بنا لیا۔ حالاں کہ اس قصہ سے پہلے وہ اپنے ملک کے اسلام پسندوں اور دینداروں کو کچلتے رہتے اور الحاد کے اصول پر کام کرنے والی "البعث العربی" پارٹی کے جھنڈے اور دستور کے تحت عراق کی حکومت چلاتے رہے اور کویت فتح کرتے ہی جہاد فلسطین کا جھنڈا اٹھا لیا۔ اور کویت چھوڑنے کے مسئلہ کو آن و عزت کا مسئلہ بنا لیا۔ حالانکہ اس کے نتیجہ میں ایک خوں آشام جنگ کا خطرہ نظر آرہا تھا جس میں ایک طرف ان کی تیار کی ہوئی طاقت تھی اور دوسری طرف متعدد زبردست طاقتیں تھیں۔

بالآخر ان کی ضد نے جنگ تک پہنچا دیا جس کے نتیجہ میں اسرائیل کو نقصان پہنچانا تو کیا ہوتا اس کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اور امریکہ کے فوجیوں کے تابوت بنانا تو کیا ہوتا خود عراقیوں کے ہزاروں فوجی خاک و خون میں لوٹ گئے۔ اور برابر جان و مال کی تباہی ہوتی جا رہی ہے اور دیکھئے کہاں رکے، عراق کے شہری اور فوجی ترقیاں ٹوٹتی اور پھوٹتی چلی گئیں اور ٹوٹتی پھوٹتی چلی جا رہی ہیں اور اسرائیل بالکل چاق و چوبند اور مضبوط ہے اور اس کو

مزید حفاظت وتقویت کے لئے مزید اسلحہ اور مدد مل رہی ہے اور عراق کے نقصانات کا حال یہ ہے کہ خود اس کے نائب وزیر اعظم سعدون حمادی نے کہا کہ اب تک ہمارے تیس ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں اور ہم کو امریکہ پچاس سال پیچھے دھکیل چکا ہے اور اب کیا چاہتا ہے۔ اور جنگ اور تباہی جاری ہے۔ اور اب تو یہ خطرہ ہے کہ شکست کے بعد عراق کے حصے بخرے کر کے مدت دراز تک اس کو کسی قابل نہ رکھا جائے۔

صدام حسین کے کویت پر قبضہ کر کے اس کو نہ چھوڑنے پر اصرار سے ایسی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو گئی پھر اس جھگڑے نے دنیا کے مسلمانوں کے درمیان بہت بڑی دراڑ ڈال دی۔ جذباتی اور نظریاتی تصادم کی گرم فضا بن گئی اور عربوں کی یک جہتی تو بالکل پاش پاش ہو گئی جس دشمن کے لئے عربوں کو سخت اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت تھی وہ اس آپسی مار پیٹ، گالی گلوچ سے مسرور و مطمئن ہوا۔ اور عرب مسلمانوں کا وہ اہم ترین خطہ جو دولت و مال کا گنجینہ تھا، میدان جنگ بنا نقصانات جو ہو رہے ہیں ان کے محیر العقول اور رنجدہ اعداد و شمار بعد میں معلوم ہو سکیں گے۔ کیا صدام حسین کے اس طریقہ کار و اصرار سے کوئی اچھا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے؟ اور اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کی جا سکتی ہے؟ لیکن رنج کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک تعداد اس میں بھی حسن ظن کی راہ نکال رہی ہے۔

حسن ظن کی راہ نکالنے والے مسلمان تین طرح کے ہیں۔ ایک تو بدعتی خیالات رکھنے والے افراد ہیں جو عرصہ سے سعودی حکومت سے حجاز میں قبروں کو سادہ رکھنے اور ان پر نذر نیاز و تقدیس کو روکنے کی وجہ سے بیزار ہیں اور ان کی یہ بیزاری ان کی اس خواہش میں تبدیل ہو چکی ہے کہ وہاں سے سعودی اقتدار ختم ہو اور وہاں ان کے علاوہ کوئی بھی آ جائے۔ ایسے مسلمانوں کی تعداد عوام میں بہت ہے۔ دوسرے مسلمانوں کے اشتراکیت پسند افراد ہیں جو سیکولر ذہن کے روشن خیال قائدین کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان کو شاہی نظام حکومت سے شدید اختلاف ہی نہیں بلکہ اس طرح کی نفرت ہے جیسی کافروں اور ملحدوں کی حکومت سے ہوتی ہے۔ وہ اشتراکی مزاج قائد کی سب کمزوریوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں لیکن شاہی نظام کے قائد کی کمزوریوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اپنے نظریہ کی اصل بنیاد بناتے ہیں۔

اس مزاج کے لوگوں کے نزدیک اگر عراق کی قومی آمدنی سعودی عرب کے لگ بھگ ہونے کے باوجود وہاں کے عوام غریب اور پھٹے پرانے حال میں ہوں تو وہ اہمیت نہ دیں گے بلکہ یہ کہہ دیں گے کہ یہ جھوٹی خبریں ہیں اور سعودی عرب میں اگر خواص عوام سب خوشحال ہوں تو کہہ دیں گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ عراق میں قومی اور حکومتی آمدنی کی فراوانی کے باوجود اسلامی مقاصد اور مسلمانوں کی بہبود کو مدد نہ دی جاتی ہو تو اس کی کوئی تاویل کر لیں گے اور سعودی عرب سے بے حد فیاضانہ مدد اور کام ہوتا ہو تو کہہ دیں گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ بادشاہ اور ان کے حوالی موالی اسراف بھی تو کرتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ لہٰذا اول الذکر بہر حال ہمدردی اور تائید کے قابل ہوئے اور آخر الذکر

نفرت اور تردید کے تیسری قسم ہمارے مخلص و دیندار قائدین میں سے بعض افراد کی ہے یہ قابلِ احترام بھی ہیں اور اچھے جذبے کے لوگ بھی ہیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عراق کا نظامِ حکومت یقیناً ملحد بعثی جماعت کے زیرِ اقتدار رہا ہے۔ صدام حسین کا ماضی بھی مذہب بیزار رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ عوام کو آزادیٔ رائے سے محروم رکھنے والا اور ظلم و جبر کا بھی رہا ہے لیکن آخر میں اس کی تقریریں اور وعدے بڑے اسلامی جذبے کے سامنے آئے کیا تعجب ہے کہ وہ بدل گئے ہوں اور اب اللہ ان سے اسلام کے فروغ کا کام لے لے۔ ہمارے ان قابلِ احترام و دیندار قائدین کا یہ حسنِ ظن ان کے دلوں کی نیکی اسلام کی سربلندی سے ان کی بے تحاشا محبت کا نتیجہ ہے اور صدام کی آخری دنوں میں باتیں اور تقریریں واقعی مؤثر اور اچھا گمان پیدا کرنے والی تھیں۔ بڑی خوشی کی بات تھی کہ یہ تصور و حسن ظن حقیقت بنتا۔ لیکن افسوس ہے کہ صدام حسین کے اس طرح کے روح پرور وعدوں اور نعروں کی مثالیں مشرقِ وسطیٰ کے گذشتہ چالیس سالہ دور میں متعدد قائدین کے یہاں ملتی ہیں جن میں شروع میں اہلِ دین خوب خوش ہوتے رہے۔ اور آخر میں خوب نقصان اٹھا کر مایوس ہوتے رہے۔

شروع میں جمال عبدالناصر پھر معمر قذافی کے معاملہ میں اس سے زیادہ یہ بات رہی۔ اگر صدام حسین کا طرزِ عمل اور ان کی زندگی ان کے اسلام پسند وعدوں اور تقریروں کے بعد بدل جاتی اور وہ ملحدانہ اصول پر مبنی بعث پارٹی سے علیحدگی اختیار کر لیتے اور اپنے ان بعثی رفقار کو جو عیسائی اور یہودی پس منظر کے ہیں۔ اب سے اپنا قریب ترین اور معتمد رفیق نہ رکھتے یا بعث پارٹی اور اس کے یہ معتمد ترین ارکان اپنے پرانے نظریات سے برأت کا اعلان کر دیتے اور صدام حسین فلسطین کو آزاد کرانے کا کام فلسطینیوں سے شروع کرتے۔ اس سے پہلے بھائیوں سے لڑنے اور اپنے ہی گروہ کی طاقت کو توڑنے سے ابتدا نہ کرتے پھر کویت فتح کر کے اپنے مجسموں کو وہاں جگہ جگہ نصب کرنے اور گھروں میں اپنی تصویریں آویزاں کرنے سے منع کرتے اور کویت فتح کر کے وہاں کے عوام کے کاروبار کو برباد اور وہاں کی دولت کو لوٹنے سے منع کرتے تو یہ ظاہر ہو سکتا تھا کہ ان میں تبدیلی آگئی ہے۔ ..... اور وہ شاید اپنے اسلامی نعروں میں مخلص ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا بلکہ ان تمام امور میں ان کا رویہ حسبِ سابق افسوس ناک ہی رہا۔ ہمارے دین دار اور مخلص قائدین نے ان باتوں پر غور کی نظر نہیں ڈالی ان کو یہ دیکھنا چاہیئے تھا اور یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس وقت دنیا میں سیاست بڑی چالاکی سے چل رہی ہے کہیں ان کے سیاست دان ان کو بھی اپنی چرب زبانی سے دھوکہ نہ دیں۔

اور اب تو حالات اور بھی زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں اچھی امیدیں موہوم ثابت ہو رہی ہیں اور خطرات حقیقت بنتے جا رہے ہیں مسلمانوں کو آپس کے تعلقات میں مالی اور جانی معاملات میں اتنا بڑا نقصان سامنے آرہا ہے جسے دیکھ کر رنج ہی رنج کیا جا سکتا ہے اور کوئی مداوا نہیں اور مزید رنج کی بات یہ ہے کہ کئی تجربوں کے بعد بھی مسلمان اب بھی چرب زبانی اور نعروں کی سیاست سے اس طرح دھوکہ کھاتے ہیں جیسے پہلے تجربہ میں کھائے افسوس! والی اللہ المشتکی +